Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"فکر نہ کر منیر۔ نشان لگ گیا تو میں آدھی قیمت پر خرید لوں گا۔"

دونوں ہنس پڑے۔

جب اعجاز گھر میں داخل ہوا تو سکینہ اور دونوں لڑکے اُٹھ کر دوڑ پڑے۔ اعجاز نے احتیاط سے موٹر سائیکل اُٹھا کر دہلیز پار کی اور اسے صحن والے کمرے کی دیوار کے برابر کھڑا کر دیا۔

"یہ کیا ہے؟" سکینہ نے پُوچھا۔

"تجھے دِکھائی نہیں دیتا کیا ہے۔"

"کس کا ہے؟"

"دکاندار کا ہے۔"

"کس دکاندار کا؟"

"سائیکل کی دکان والے کا ہے بھئی۔ ٹرائی کے لِئے لایا ہُوں۔"

"کیوں؟"

"کیوں کا کیا مطلب؟ ٹھیک نکلا تو خرید لوں گا۔"

"خرید لوگے؟ یہ تو ہزاروں کا ہو گا۔"

"پھر کیا ہے۔ تو جیتی رہ، اِسی طرح سنبھال کے کاروبار کرتی رہی تو کار بھی آ جائے گی۔"

"اور تم اِس پہ چڑھ کے ساری ساری رات سیر کرتے رہو، ہیں؟ کل کے گئے ہوئے آج آ نکلے ہو۔"

"ابا، یہ ہمارا ہو جائے گا؟" حسن نے پُوچھا۔

"ابا مجھے بھی چلانا سکھا دو گے؟" حسین بولا۔

"ابا، سیکل میں لے لوں گا۔"

"جاؤ ے، بڑا معتبر آیا۔ تو کیسے لے لے گا۔" حسین جارحانہ انداز میں بولا۔ حسن دبک کر چپ ہو رہا۔ دونوں لڑکے ہیجانی کیفیت میں موٹر سائیکل کے گِرد چکر لگا رہے تھے۔

"اوئے ہٹ جاؤ،" اعجاز نے کہا، "پرے ہو جاؤ۔ جس نے اس کو ہاتھ لگایا اُس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چمڑی اُتار دوں گا۔" اعجاز سیدھا اندر جا کر چارپائی پہ لیٹ گیا۔ سکینہ دُوسری چارپائی پہ بیٹھ گئی۔

"کہاں رہ گئے تھے؟" سکینہ نے پُوچھا۔

"ملتان چلا گیا تھا۔"

"تُم پرسوں بھی ملتان گئے تھے۔"

"ہاں۔"

"پھر کل کیا کرنے گئے تھے؟"

"کام تھا، بتایا تو ہے۔"

سکینہ معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ "بتاتے کیوں نہیں کہ بشیر رائیں سے ملنے گئے تھے۔"

"تجھے کِس نے بتایا ہے" اعجاز نے چونک کر پُوچھا۔

"زلفی ریہڑے والے کو شہر میں منظور ملا تھا۔ منظور نے اُسے بتایا ہے۔"

"ہاں،" اعجاز کروٹ سے ہل کر سیدھا پشت پہ لیٹ گیا۔

"یہ بشیر رائیں وہی ہے جو تمہاری مصلّن کو نکال کر لے گیا تھا؟"

جواب میں اعجاز نے حلق سے 'ایہہ' کر کے ناگوار سی آواز نکالی۔ "میرے خلاف جھوٹی باتیں تجھے کون بتاتا رہتا ہے؟"

"جھوٹی نہیں ہیں۔ سارا زمانہ جانتا ہے۔"

"تُو کانوں کی کچی ہے۔ لائی لگ ہے۔ حسنے، حسینے،" اُس نے لڑکوں کو آواز دے کر بلایا۔ "آؤ۔ میری ٹانگیں دباؤ۔"

لڑکوں نے چارپائی کے دونوں جانب بیٹھ کر باپ کی ایک ایک ٹانگ سنبھالی اور زور زور سے دبانے لگے۔

"مصلّن ابھی اُس کے ساتھ ہے یا چھوڑ کے بھاگ گئی ہے؟"

"تجھے کوئی اور بات کرنے کو نہیں ملتی؟ میرا دماغ پہلے ہی خراب ہو رہا ہے۔"

سکینہ نے دِل کا غبار نکالنے کے بعد موضوع بدل دیا۔ "زلفی کو منظور نے بتایا ہے کہ تم نے کام ختم کر دیا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اعجاز خاموش رہا۔

"کیوں، ٹھیک ہے یا غلط؟"

"ہاں،" اعجاز آہستہ سے بولا۔

"ہاں کیا؟"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب پیچھا بھی چھوڑ، سر کھائے جا رہی ہے۔"

"تمہارا سر بڑا نازک ہے ناء۔ میں فجر کی اذان تک بیٹھی جاگتی رہی ہوں، میرے سر کو کچھ نہیں ہوا۔"

"تیرا سر تو لکڑی کا ہے، اِسے کبھی کچھ نہیں ہوتا۔ اوئے،" وہ لڑکے پر چیخا "ہاتھ ہولا رکھ۔"

"اللہ کا شکر ہے تم نے کام چھوڑ دیا ہے۔ ٹھیکہ ختم ہونے کو ہے۔ زمین واپس لے کر خود کھیتی کرو، کچھ ہاتھ میں بھی آئے۔ ٹھیکے والے تو اپنی قسمت کو ہی روتے رہتے ہیں۔"

"ٹھیکہ تو نے اور چاچے نے دیا تھا۔ اب روتی کیوں ہو؟"

"تم کچھ کرنے والے ہوتے تو ہمیں کیا سانپ نے کاٹا تھا کہ زمین دُوسروں کے ہاتھ میں دیتے؟ بس ٹھیک ہے، اب کوئی اور کام اپنے سر مت لینا۔ گھر میں رہ کر کاشت کراؤ۔ کچھ لڑکوں کا بھی خیال کرو۔ سارا دِن باہر دُڑنگے مارتے رہتے ہیں۔ میرے قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ میں کِس کس کام کو سنبھالوں؟"

اعجاز ٹانگیں دبواتے دبواتے سو گیا۔ سکینہ اُٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے آواز دے کر کہا۔

"اوئے حسنے، ابے سے پُوچھ روٹی کھانی ہے؟"

دونوں لڑکوں نے باری باری باپ کو جھنجوڑا۔ "ابا، ابا، بی بی کہتی ہے روٹی کھانی ہے؟" اعجاز نے نیند میں اُوں آں کی آواز نکالی اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

"پتا نہیں کہاں کہاں سے پھر پھرا کر آیا ہے،" سکینہ اپنے آپ سے بولی، "اب خالی پیٹ سو گیا ہے۔ اُٹھ کر کہے گا میرے بدن میں درد ہو رہی ہے۔"

اعجاز شام کے وقت اُٹھا اور روٹی کھا کر پھر سو گیا۔ صبح سویرے جب وہ اُٹھا تو اُس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جسم ہلکا پھلکا تھا۔ نہا دھو کر جب وہ ناشتہ کرنے بیٹھا تو اُس کا مزاج حیرت انگیز طور پہ خوشگوار تھا اَور دِل کھلا ہوا تھا، جیسے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو۔

"کپڑا لے کر موٹر سائیکل کو صاف کرو،" اُس نے لڑکوں سے کہا۔ "گندے ہاتھ نہ لگانا۔" لڑکے خوشی خوشی جا کر موٹر سائیکل کی گرد صاف کرنے لگے۔

"کہاں جا رہے ہو؟" سکینہ نے دُوسرا پراٹھا اُس کے سامنے رکھتے ہُوئے پوچھا۔

"منظور کو ملنے جا رہا ہُوں۔ اُس کے پاس میرے کاغذات ہیں۔"

اعجاز نے سفید لٹھے کی دُھلی ہُوئی شلوار قمیض پہنی۔

"جلدی آ جانا،" سکینہ نے کہا۔ "ابے کو بلایا ہے۔ بیٹھ کر کوئی بات کریں گے۔"

"ابا، موٹر سیکل صاف ہو گیا ہے۔ باہر لے جائیں؟"

"میں نے تم سے کہا ہے اِس کو ہاتھ نہیں لگانا۔ پرے ہو جاؤ۔"

مگر جب اعجاز نے موٹر سائیکل دہلیز سے نکالا اَور اُسے نالی سے بچا بچا کر دھکیلتا ہوا گلی کے سرے تک لے گیا، تو حسن بولا۔

"ابا ایک جھوٹا تو دے دو۔"

تمہارے سکُول کا وقت ہو گیا ہے۔ چلو جاؤ۔"

"ابھی دیر ہے،" حسین بولا۔ "بس سڑک تک۔"

اعجاز نے دونوں لڑکوں کو پیچھے بٹھایا اَور احتیاط سے چلاتا ہوا سڑک تک لے گیا۔

"چلو اب اُترو۔"

"ابا سڑک پر تھوڑی دور،" دونوں لڑکے بولے، "ذرا تیز۔"

اعجاز نے موٹر سائیکل کا رخ شہر سے اُلٹی جانب موڑا اَور آدھے میل تک تیز چلا کے لے گیا۔ ہوا لڑکوں کے چہروں سے رگڑ کھا کے گزُری تو اُنہوں نے چیخ چیخ کر ہنسنا شرُوع کر دیا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد اعجاز نے اَپنے بچوں کی ہمراہی میں اِس انوکھے لطف کو محسوس کیا تھا۔ واپسی پر اُس نے کچے راستے پر موٹر سائیکل روک لی۔ "اب دوڑ جاؤ،" وہ بولا۔ "سکُول سے دیر ہو گئی تو تمہیں درست کروں گا۔"

آٹھ دس منٹ کے اندر اعجاز شہر میں اَپنے علاقے کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ اپنے دفتر کے سامنے سے گزُرتے ہُوئے اُس نے اِرادتاً رفتار بہت دھیمی کر لی۔ اُس نے دُور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے دیکھ لیا تھا کہ شیدا تلوار دروازے میں کھڑا چند لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔ ان کے مقابل پہنچ کر اعجاز نے اُن پر سرسری نگاہ ڈالی۔ وہ سب باتیں چھوڑ کر اعجاز کو دیکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے اعجاز کو سلام کیا، جس کا جواب اُس نے ہاتھ اُٹھا کر دیا اَور اُسی رفتار سے گزُر گیا۔ اُسے پتا تھا کہ وہ سب مُنہ اُٹھائے اُسے دُور تک دیکھتے رہے ہونگے۔ وہ سَر اُٹھائے، اکڑ کر موٹر سائیکل پہ بیٹھا تھا اَور اُس کا دِل، جو صبح سے ہلکا تھا، اب اُڑنے لگا تھا۔ وہ تھوڑی دُور ہی گیا ہو گا کہ ایک بس سٹاپ پر اُسے مانوس چہرہ نظر آیا۔ بیس گز آگے جا کر اُسے یاد آیا کہ یہ بدیع الزمان تھا۔ کئی سال پہلے یہ اخباری رپورٹر ہوا کرتا تھا، جس نے پہلی بار اعجاز سے ملاقات کر کے اُس کی تصویر اَور ایک مختصر سا بیان ایک بڑے اخبار میں چھاپا تھا۔ بعد میں ترقی کرتے کرتے وہ ایک نئے روزنامے کا ایڈیٹر ہو گیا تھا۔ اعجاز کے ساتھ اُس کی چند بار ملاقات ہو چکی تھی۔ اعجاز واپس مڑ آیا۔ بس سٹاپ سے شیدا تلوار اَور اُس کے ساتھی دکھائی دے رہے تھے جو سب کے سب ابھی تک اعجاز کی جانب مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ بدیع الزمان سٹاپ پہ کھڑا اخبار پڑھنے میں منہمک تھا۔

"بدیع صاحب، چلیئے آپ کو چھوڑ آؤں۔"

بدیع الزمان نے اخبار سے سَر اُٹھا کر دیکھا۔ "اخاہ، ملک اعجاز صاحب، السلام علیکم۔ کیسے ہیں۔ خیریت سے ہیں؟"

"بالکل خیریت سے ہُوں۔ اللہ کا کرم ہے۔ آیئے۔"

"میں آپ کے وقت کا حرج نہیں کرنا چاہتا۔" بدیع الزمان نے کہا۔

"وقت نہ ہوتا تو میں رُکتا ہی کیوں بدیع صاحب۔ آیئے آیئے۔"

"ہاں، آج کل تو شاید آپ کے پاس کچھ وقت فارغ ہو،" بدیع الزمان بولا۔

اُس نے اعجاز کی پچھلی نشست پر جم کر بیٹھنے، اَپنا تھیلا گود میں سنبھالنے اَور ناک پر عینک کو درست کرنے میں کچھ وقت لیا۔ پھر کچھ سوچ کر عینک اُتار دی اَور جیب میں رکھ لی۔ "اللہ کا نام لے کر چلیئے۔ میں بھی وِرد کرتا ہوں۔ مجُھے اِن سواریوں سے خوف آتا ہے۔"

اعجاز روانہ ہوا تو بدیع الزمان بات جاری رکھتے ہُوئے بولا، "ہاں، آپ کے سیٹ اَپ میں کچھ ردوبدل کی خبریں ملی ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ کو کس نے بتایا ہے؟"

"بھئی اخبار نویس ہیں۔ حالات سے باخبر رہنا ہمارا پیشہ ہے۔"

"اعجاز ہنسا۔ "یہ تو درست ہے بدیع صاحب۔ خبر بھی کم و بیش درست ہی ہے۔"

"کچھ تفصیلات بتایئے۔"

"تفصیلات کا ابھی مجھے پوری طرح علم نہیں،" اعجاز نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "جب پتا چل گیا تو ضرور بتاؤں گا۔ آپ سنایئے، "طلوع" کیسا چلا رہا ہے؟"

"وہاں سے تو میں فارغ ہو گیا ہوں،" بدیع الزمان نے کہا۔

"فارغ ہو گئے؟ کیوں؟"

"بس چھوڑ دیا۔ مالکان کے اور میرے خیالات میں فرق تھا، دخل اندازی کرتے تھے۔ میں وہاں چل نہیں سکا۔ استعفیٰ دے دیا۔"

"افسوس کی بات ہے،" اعجاز نے کہا۔ "اب کیا کر رہے ہیں؟"

"بھئی میں نے سوچا کہ مالکان کوئی اور ہوں اور ایڈیٹر کوئی اور تو کام دیر تک نہیں چل سکتا۔ اخبار اپنا ہی اچھا ہوتا ہے، چاہے چھوٹا ہو۔ چنانچہ میں نے ہاتھ پاؤں مار کر ایک ہفتہ وار نکالا ہے۔ ابھی اس کے تین اشو نکلے ہیں۔ خبر نہیں کتنے روز چلے گا۔ ابھی تو ہم سیٹھنگ ٹربلز سے ہی نہیں نکل سکے۔ قسمت یاور ہوئی تو چل نکلے گا، ورنہ قلم کان میں اڑس کر پھر کسی طرف کو نکل پڑیں گے،" وہ ہنسا، پھر جلدی سے بولا، "ارے اس طرف نہیں بھئی، یہ تو "طلوع" کے دفتر کو جا رہے ہیں، اب میرا دفتر دوسری طرف ہے۔ آگے چوک سے سیدھے ہاتھ کو مڑ جایئے۔"

ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک پر بدیع الزمان نے اعجاز کو رکوا لیا۔ "چلیئے، کچھ تھوڑا وقت ہے تو ایک چائے کی پیالی ہو جائے۔ گپ شپ رہے گی۔ ہمارا سیٹ اپ بھی دیکھیے۔"

"میں ایک دوست کی خبر لینے جا رہا تھا،" اعجاز موٹر سائیکل دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے بولا، "چلیئے تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتا ہوں۔"

اعجاز بدیع الزمان کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ دفتر ایک چھوٹے سے چوبارے میں تھا جس کی کھڑکیاں پچھلی گلی میں کھلتی تھیں۔ ایک میز، تین چار کرسیاں، دو تپائیاں، ایک ٹائپ رائیٹر دفتر کی کل اوقات تھی۔ اخباروں، رسالوں اور سادے کاغذوں کے ڈھیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے علاوہ تھے، جن کے درمیان گھرا ہوا ایک نوجوان لڑکا کرسی پہ بیٹھا تپائی پہ جھک کر کچھ لکھ رہا تھا۔ چلنے پھرنے کی جگہ کچھ کم تھی مگر چوبارہ صاف ستھرا تھا اور اس میں ایک خاص ترتیب سے بے ترتیبی نظر آ رہی تھی۔

"یہ میرا اسسٹنٹ ہے،" بدیع الزمان نے تعارفاً کہا۔ اور پیشتر اس کے اعجاز نوجوان سے مصافحہ کرتا، بدیع الزمان اُسے بازو سے پکڑ کر ایک کونے میں لے گیا، جہاں اُس کے ہفتہ وار کا ڈھیر لگا تھا۔ اُس نے اُوپر سے ایک پرچہ اُٹھا کر اعجاز کو دکھایا۔ "کیسا ٹائیٹل ہے؟"

"واہ،" اعجاز نے پرچہ اُس کے ہاتھ سے پکڑتے ہُوئے کہا۔ "'بہ بانگ دہل، بہت خُوب۔"

"پہلے اس کا نام 'نقطہ نظر' تجویز ہُوا تھا۔ مگر اُس میں مجھے کوئی چاشنی نظر نہیں آئی۔ کیا خیال ہے؟"

"بالکل درست ہے۔"

"بھئی بات یہ ہے کہ اگر کچھ کہنا ہے تو بہ بانگ دہل کہیئے۔ چاہے چار دن ہی کہیئے۔ کیوں، ٹھیک ہے ناء؟ بھئی شمس، ملک صاحب کو چائے تو پلاؤ۔" بدیع الزمان اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور اعجاز کو سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اِشارہ کرکے بولا، "ایک میرے عزیز ہیں، اُنہوں نے کئی سال سے ڈیکلریشن حاصل کرکے رکھی ہُوئی تھی۔ بس پرچے کا نام بدلنے کی ٹیکنیکیلٹی تھی، وہ کروا لی۔ کچھ دوستوں سے مانگا، کچھ رشتہ داروں نے مدد کی، میرے ایک پھوپھا بینک میں ہیں، کافی سینئر پوسٹ پر ہیں، کچھ اُنہوں نے ہاتھ بٹایا، گارنٹی کی صورت میں، مگر بینک گارنٹی بھی سکہ بند چیز ہے۔ بہرحال اِتنا کچھ ہو گیا کہ شُروع کر سکوں۔ اخبار اصل میں اِشتہاروں پر چلتا ہے۔ اِس کے لِئے کانٹکٹ ہونے چاہئے۔ ابھی تک تو شوسٹرنگ آپریشن ہے۔ مگر رسپانس اچھا ہے۔ پڑھا جا رہا ہے، اور اِس پہ کمنٹ بھی ہو رہا ہے۔ کافی حوصلہ افزا حالات ہیں،" وہ بے یقینی سے ہنسا اور سگریٹ کے کش لینے لگا۔ "تُم بتاؤ، تمہارا اب کیا پروگرام ہے؟"

"مجھے بھی ارباب بست و کشاد اخبار نویسی کی جانب دھکیلنے والے تھے،" اعجاز ہنس کر بولا۔ "بال بال بچا ہُوں۔"

"کہاں؟" بدیع الزمان چوکنا ہو کر بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کوئی پارٹی کا اخبار نکال رہے ہیں۔"

"وہ قمر الاسلام والا تو نہیں؟"

"وہی ہے۔"

"ہنہہ،" بدیع الزمان حقارت سے بولا۔ "میں قمر کو بیس سال سے جانتا ہوں۔ پارٹی کا پٹھو ہے۔ ساری عمر باتوں کی کمائی کھاتا رہا ہے۔ وہ اپنے قصبے کا ایک ورق کا لوکل پرچہ نہیں نکال سکتا۔ ڈیلی پیپر نکالنا کوئی خالہ جی کا گھر ہے؟ ملک اعجاز، اگر اخبار کا کام ہی کرنا ہے،" وہ آگے جھک کر اپنائیت سے بولا، "تو یہاں آ جاؤ، تمہارا اپنا پرچہ ہے، تنخواہ و نخواہ نہیں دے سکتا۔"

"خدا کا شکر ہے، اسکی ضرورت نہیں۔"

"ہاں ہاں، جانتا ہوں، پیچھے سے ماشاء اللہ تگڑے ہو۔ میں کئی بار سوچا بھی کرتا تھا، تمہاری بیک گراؤنڈ کا آدمی یونین وغیرہ کے چکروں میں نہیں پڑتا۔ ہم تو حالات کے آگے آگے بھاگتے ہوئے جدھر کو دھکیل دیئے گئے اُدھر کو جا نکلے۔"

"حالات ہی اِدھر اُدھر لے جاتے ہیں بدیع صاحب،" اعجاز نے کہا۔ "حالات ایک بندے کے دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں، مگر نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے۔ حالات ہماری سمتیں متعین کرتے ہیں۔"

"تمہارے جیسا تجربہ کار اور تعلق واسطہ رکھنے والا آدمی تو اس کام میں بہت کامیاب ہو سکتا ہے۔"

اعجاز ہنسا۔ "آپ کو ایک بات بتاؤں؟ کل ہی ایک آدمی سے ملا ہوں جو کہہ رہا تھا کہ جرنلزم سیاسی معصومین کا اکھاڑہ ہے۔"

"ہاں ہاں،" بدیع الزمان عادی سگریٹ نوشوں کی مخصوص ہنسی ہنسا۔ "ایک سنکی دیوپوائنٹ یہ بھی ہے۔ مگر جناب، میں نہ سیاسی ہوں، نہ معصوم ہوں۔ سیاست چھوڑ دی ہے، اور معصومیت کھو دی ہے۔" وہ اپنی بات پر دوبارہ پُورے زور سے ہنسا۔ "اب تو انسان کا انسان کے اُوپر ظلم روکنا میرا مشن ہے۔ چھوٹی برائیاں بڑی برائیوں کو جنم دیتی ہیں۔ آج کل ایک گھی سکینڈل کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ خراب گھی کھا کھا کر سینکڑوں لوگ بیمار پڑ رہے ہیں۔ بڑے بڑے اخباروں نے خبر دبا دی ہے۔ مگر میں نے یہ کام اپنے ذمے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لے لیا ہے۔ ریکارڈ جمع کر رہا ہوں۔" بدیع الزمان نے میز کا دراز کھول کر ایک لمبا سا کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور اعجاز کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لسٹ ہے اُن لوگوں کی جو بیمار پڑے ہیں۔ نام اور پتے سب مکمل ہیں۔ دیکھو،" اُس نے ایک جگہ پر اُنگلی رکھ کر کہا، "یہ دو آدمی موضع نُور پُور کے ہیں، جو تمہارا ہی علاقہ ہے۔ میں نے ایک فری لانس کو اِس کام کے پیچھے لگایا تھا، مگر زیادہ پیش رفت نہیں ہُوئی۔ یہ جُرأت والے آدمی کا کام ہے۔ تجربہ کار آدمی کا کام ہے۔ اِس میں بہت سے اینگل ہیں، کافی چیزیں اِنوالو ہیں۔ اگر تمہارے جیسا کوئی آدمی میرے ساتھ ہو تو گارنٹی سے کہتا ہوں، بامب شیل ہو گا، بامب شیل۔"

"یہ بات تو درست ہے۔" اعجاز نے کہا۔

"شمس، بھئی ملک صاحب کو ایک اور چائے بنا کر دو۔"

"نہیں، ایک پیالی کافی ہے۔ میں چائے کا عادی نہیں ہُوں۔" اعجاز اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اب اجازت دیجئے۔ پھر ملاقات ہو گی۔"

"بدیع الزمان اعجاز کو سیڑھیوں تک چھوڑنے کے لِئے آیا۔ "پھر کیا خیال ہے؟" وہ اعجاز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"کس بارے میں؟"

"ہو جائے معرکہ؟" بدیع الزمان آنکھ مار کر بولا۔ "مل کے کرتے ہیں۔"

"ابھی تو میں سنبھلا بھی نہیں بدیع صاحب،" اعجاز ہنس کر بولا۔ "کچھ زمینداری کے معاملے نبٹانے ہیں۔ ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"سنجیدگی سے غور کرو ملک، بامب شیل ہے۔ نام نِکل جائے گا۔" بدیع الزمان نے ہوا میں اُنگلی اور انگوٹھا پھیلا کر اخبار کی سرخی کی لکیر کھینچی۔ "ملک۔ محمد۔ اعجاز۔ بولڈ ٹائپ میں چھاپوں گا۔"

اعجاز سر ہِلا کر ہنسا، اور بدیع الزمان سے ہاتھ ملا کر رُخصت ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باب 15

پیاری چھیمی۔ کل میجر صدیق کا دِماغ خراب ہو گیا۔ سچ مُچ کا خراب نہیں ہُوا، وقتی طور پر غصّے کی وجہ سے آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ میجر صدیق وہ آدمی ہے جس نے ٹماٹر کا پودا لگایا تھا۔ دراصل اِس نے تین چار بیج بوئے تھے، مگر وہ انہیں پانی اِتنا زیادہ دیتا تھا کہ بیج پھُوٹنے کے بعد خُشک ہوتے چلے گئے تھے۔ صرف ایک پودا جڑ پکڑ گیا۔ میجر صدیق کی حالت دیکھنے والی تھی، پھُولا نہ سماتا تھا، پانی پہ پانی دیئے جاتا تھا۔ یہ سپلائی کور کا رینکر ایک جنرل کی طرح میدان میں پھرتا تھا۔

"میجر صاحب،" لوگ اسے کہتے، "پانی دے دے کر آپ نے باقی کے بیج مار دیئے ہیں۔ اب اِس کو بھی لے ڈُوبیں گے۔"

"تُم مجھے سکھا رہے ہو" میجر صدیق جواب دیتا۔ "میں بچپن سے ٹماٹر اگا رہا ہُوں۔ میرے گھر میں ٹماٹر کے بارہ پودے ہیں۔"

"کچھ مٹی، پانی اَور ہوا کا بھی اثر ہوتا ہے جناب۔"

"جاؤ جاؤ،" میجر صدیق کہتا۔ "تُم سب میرے دُشمن ہو۔ تم نہیں چاہتے کہ میں ٹماٹر کھاؤں۔" پتا چلا کہ ٹماٹر میجر صدیق کی مرغوب سبزی ہے اَور ایک سال سے اُوپر ہو چُکا ہے کہ اِس نے ٹماٹر نہیں چکھا۔ اُس کی خُوش قسمتی تھی کہ پانی میں ڈُوبنے کے باوجُود پودا بڑھتا گیا۔ اب میجر صدیق دن کا بیشتر حِصّہ اِس کے گرد منڈلاتے ہُوئے گزارتا تھا۔ پودا آہستہ آہستہ پورے قد کو پہنچ گیا، وقت بھی پورا ہو گیا، مگر پھل کا نشان نہ نِکلا۔ لوگوں نے دبے دبے لفظوں میں کہنا شُروع کر دیا کہ یہ بیج بانجھ ہے۔ میجر صدیق کی آنکھوں کی چمک مانڈ پڑ گئی۔ وہ دِن بھر ایک ایک شاخ، ایک ایک کونپل کا ملاحظہ کرتا رہتا اَور نماز کے بعد گڑ گڑا کر دُعا مانگتا۔ کئی لوگوں کا کہنا تھا کہ اُنہوں نے اَپنے کانوں سے اسے خدا تعالیٰ سے ٹماٹر کی بھیک مانگتے ہوئے سُنا ہے۔ آخر میجر صدیق کی دُعائیں بار آور ثابت ہُوئیں۔ ایک روز پودے پر ٹماٹر کی ایک ننھی سی سبز گولی نمودار ہُوئی۔ اب کیا تھا، میجر صدیق کی کُرسی پودے کے پاس بچھ گئی۔ سارے کے سارے افسر ایک ایک دو دو کر کے اِس پھل کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھنے اَور میجر صدیق کو مبارکباد دینے کے لئے آئے۔ میجر صدیق کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی۔ وہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر کرسی لیتا اَور جا کر پودے کے پہلو میں بیٹھ جاتا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وہ تسبیح پر وظیفہ کرتا رہتا وہاں سے وہ صرف نماز کے وقت اَور کھانے کے لئے اٹھتا اَور پھر واپس پہنچ جاتا۔ دن گزرتے گئے اَور کوئی مزید ٹماٹر نہ نِکلا، مگر وہ ایک جو پیدا ہُوا تھا، بڑا ہوتا گیا، حتی کہ اُس کا حجم ایک عام ٹماٹر سے بھی بڑا ہو گیا اَور رنگ سبز سے بتدریج سُرخ ہوتا ہُوا آخر بیر بہوٹی کا سا ہو گیا۔ جیسے جیسے ٹماٹر کا رنگ بدلتا گیا، میجر صدیق کے چہرے پہ بھی سُرخی کی لہر دوڑتی گئی۔

"میجر صاحب،" اِس کے ساتھی کہتے، "اب یہ پک گیا ہے، اسے اُتار لو، لٹکا لٹکا گل سڑ جائے گا۔"

"میں ٹماٹر کی خصلت جانتا ہوں،" میجر صدیق جواب دیتا، "اور ٹماٹر میری خصلت جانتا ہے دِس اِز مائی بے بی۔ جب یہ پوری طرح پک جائے گا اَور اِس کی کھٹائی مٹھاس میں بدل جائے گی تو اِس کی خُوشبو سے مجھے خُود بخود پتا چل جائے گا۔"

اس سارے عرصے میں میجر صدیق نے ایک پیدائشی سپاہی کی مانند اِس ٹماٹر کی حفاظت کی، جیسے کہ اِس کی تمامتر ناموس کا اِنحصار اُس ٹماٹر پہ ہو۔ گو کھانے کی حد تک ہمارا اُس ٹماٹر میں کوئی حِصّہ نہ تھا، میجر صدیق کی والہانہ سروس ہم سب کے لئے باعث عزت و اِفتخار بن گئی۔

پھر کل کا دن آ پہنچا۔ صبح ہُوئی تو ٹماٹر پودے سے غائب تھا۔ ہماری آنکھ ہی میجر صدیق کی چیخ و پکار سے کھلی۔ ہم بستر سے اُٹھ کر باہر گئے تو دیکھا کہ میجر صدیق کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اِس کا رنگ کاغذ کی مانند سفید تھا، جیسے سارا خُون دل کی جانب یورش کر گیا ہو، اَور اُس کی شورش سے صدیق کے مُنہ سے بات نہ نِکل رہی تھی، جیسے حلق میں آ کر اٹک گئی ہو۔ وہ تتلائے جا رہا تھا۔ اُس کے مُنہ سے نِکلتی ہُوئی جھاگ کے ننھے ننھے ذرے اُس کی ڈاڑھی میں اٹکے جا رہے تھے۔ اِس کے ہاتھ ہوا میں ناچ رہے تھے اَور بازوؤں کی حرکت میں کسی سمت کا تعین نہ تھا۔

"میں جان سے---- جان سے مار---- دوں گا۔ قتل کردوں گا--- میں---- میں ڈھونڈ لوں گا۔ پتا چلاؤں گا، دیکھتے---- دیکھتے رہو، یاد رکھو، میں----

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں وارن کر رہا ہوں۔ جس نے کھایا اُس کو نہیں چھوڑوں گا۔" میجر صدیق نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اکڑا کر ہاتھ ایک دُوسرے سے جوڑ دیئے، گویا کسی کا گلا دبا رہا ہو۔ اُس کے نمازی وظیفہ گو ساتھی اُس کے گرد کھڑے تھے، مگر میجر صدیق کی کیفیت دیکھ کر کسی کی جرأت نہ ہو رہی تھی کہ تسلی کا ایک لفظ کہے۔ سب لوگ جیسے جیسے اِس کے شور سے جاگ رہے تھے، باہر نِکلتے آ رہے تھے۔ سب کبھی میجر صدیق کو اَور کبھی ٹماٹر کے پودے کو دیکھ رہے تھے۔ سچی بات ہے کہ وہ ٹماٹر کا پودا، جس کا قد کاٹھ ایک چھوٹے سے درخت کے برابر تھا اَور جس پہ سینکڑوں سبز پتے تھے کہ ٹہنیاں نظر نہ آتی تھیں، اِس ایک ٹماٹر کے بغیر ننگا لگ رہا تھا۔ غیظ و غضب کے مارے میجر صدیق کی پھٹی ہُوئی آواز پودے کی عریانی کو مزید عیاں کر رہی تھی۔

"ٹماٹر کا چھلکا ہضم نہیں ہوتا" وہ چلا رہا تھا، "فضلے کے ساتھ نِکل آتا ہے۔ میں ایک ایک کا فضلہ چیک کروں گا۔ ڈھونڈ کر--- ڈھونڈ کر دَم لوں گا---- چھوڑوں کا نہیں----"

سکھ گارڈ، جو کچھ دیر تک ہمدردی سے کھڑے دیکھتے رہے تھے، آخر تنگ آ گئے۔ اُنہوں نے میجر صدیق کے علاوہ سب کو اَندر جانے کا اشارہ کیا۔ لوگ ایک ایک کر کے ہٹنا شُروع ہوئے۔ ہم اَندر لوٹ رہے تھے کہ میجر کو کہتے ہُوئے سنا،

"جو اسے کھائے گا اسے یہ زہر بن کر لگے گا---- سنکھیا بن کر---- سنکھیا----"

سنا ہے کہ کل رات کو عشاء کی نماز کے بعد میجر صدیق اتنی دیر تک سجدے کی حالت میں پڑا رہا کہ اِس کے ساتھیوں نے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اُس کو اٹھایا کہ بیرک میں جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ لوگوں نے اسے سجدے میں آنسو بہاتے ہوئے دیکھا۔ آج صبح میجر صدیق اکیلا اکیلا میدان میں چل پھر رہا تھا۔ ہم سب کو میجر صدیق کی کرسی کے بغیر میدان خالی خالی سا لگا۔ دُوسری کیاریوں میں چند سبزیاں اَور کچھ پھُول لگے تھے، مگر اِس ایک ٹماٹر کے جانے سے معلوم ہوتا تھا کہ سارا میدان ہی اُجڑ گیا ہے۔ کسی نے اُس سرسبز کونے کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ کی----

سرفراز نے قلم کا سرا سیدھا کیا اَور اِس چھپے ہُوئے کارڈ کی خالی جگہ پر اپنے پچیس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لفظ لکھنے شروع کئے۔ ''ڈیرسٹ چھمو۔ مجھے اِس سارے مہینے تمہارا خط نہیں ملا۔ میں ٹھیک ہُوں۔ صحت اچھی ہے۔ نگہداشت دُرست ہو رہی ہے۔ لالے کو سلام۔ سری۔''

پہلے پہل سرفراز دوچار لفظ زیادہ لکھ دیا کرتا تھا۔ مگر جب سے اسے پتا چلا تھا کہ ایک لفظ بھی زیادہ ہو تو کیمپ کی ڈاک والے اِس پہ کالی سیاہی پھیر دیتے ہیں، وہ گن کر الفاظ لکھنے لگا تھا۔

مائی ڈیر نسیمہ۔ کل رات ہم نے دعوت کھائی۔ پورا تھری کورس ڈنر، اور اُس کے بعد کافی۔ تفصیل اِس کی یُوں ہے کہ میجر شاہ زمان پرسُوں پیٹ کی خرابی کی وجہ سے بستر پہ پڑ گیا۔ موشن اور الٹیاں نہ رکیں تو ہم نے شور مچایا۔ آخر اِن لوگوں نے اسے ہسپتال بھیج دیا۔ ہسپتال کیمپ کے اندر ہی ہے۔ ہسپتال کا دستور ہے کہ ہر مریض جو داخل کرلیا جاتا ہے اُسے روزانہ ایک انڈہ کھانے کو ملتا ہے۔ اَب شاہ زمان ایک بار باتوں باتوں میں ہمیں بتا چکا تھا کہ اُسے انڈے سے سخت نفرت ہے اور آٹھ سال کی عمر کے بعد اِس نے آج تک انڈے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جب وہ ہسپتال لے جایا جا رہا تھا تو کپٹن عزیز نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہُوئے شاہ زمان کے کان میں ہدایت کر دی کہ ایک تو وہ انڈہ لینے سے انکار نہ کرے، اور دُوسرے یہ کہ اُبلا ہُوا انڈہ طلب کرے۔ پرسوں تو اسے ڈرپ وغیرہ لگی رہی۔ کل صبح اِس کا پیٹ ٹھہر گیا تو ہسپتال کی خوراک جاری کر دی گئی۔ ہم نے لفٹننٹ فضل کو، جو ایسے کاموں میں ہشیار ہے، وِزٹ کے لئے تیار کیا۔ یُوں تو بیمار پرسی کے لئے ایک آدھ آدمی کو وزٹ کی اجازت ہے، مگر آج کل کسی وجہ سے عموماً انکار کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ فضل نے ایک بہانہ یُوں گھڑا کہ شاہ زمان اِس کے پیروں کی اولاد سے ہے اور اس کے پیر اسے رات کو خواب میں دکھائی دیئے ہیں جنہوں نے حکم دیا ہے کہ فوراً فضل کو جا کر اِس کی خبر لینی چاہئے۔ فضل نے میجر چٹوپادھیائے سے کہا کہ اگر اُس نے اپنے پیروں کی حکم عدولی کی تو اُس پر آفت نازل ہو جائے گی۔

''تمہارے اُوپر تو آفت آ گئی،'' میجر چٹوپادھیائے نے انگریزی میں کہا، ''اس سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑی آفت کہاں سے آئے گی؟ ہم تمہاری حفاظت کر رہے ہیں، کوئی ایکسٹرا آفت نہیں آنے دیں گے۔"

"نہیں سر، میرے اُوپر تو آپ کا پہرہ ہے مگر میرے پیچھے گھر والوں پر آفت آجائے گی وہ بے قصور مارے جائیں گے۔"

غرضیکہ لفٹننٹ فضل نے ایسی دلیلیں پیش کیں کہ کچھ لے دے کے بعد اُسے پانچ منٹ کی وِزٹ کی اِجازت مِل گئی۔ شاہ زمان تک پہنچتے پہنچتے تین جگہ پر فضل کی تلاشی ہُوئی۔ پہلی اَپنے احاطے سے نِکلتے وقت، دُوسری اگلے احاطے میں داخل ہونے کے وقت اَور آخری ہسپتال کے دروازے پر۔ اُسے علم تھا کہ واپسی پر بھی اِسی طرح تین تلاشیاں ہوں گی، چنانچہ جب شاہ زمان نے آنکھ بچا کر انڈہ فضل کے حوالے کر دیا تو اُس نے انڈے کو پہلے جراب میں اُڑسا، پھر بغل میں پکڑا، مگر کسی جگہ محفوظ نہ پا کر آخر اُس نے پتلون کی پیٹی کھولی اَور فوتے سیدھے کرنے کے بہانے ہاتھ اَندر داخل کر کے انڈہ رانوں کے بیچ دبا لیا۔ پھُونک پھُونک کر قدم رکھتا ہُوا وہ واپس لوٹا تو دو تلاشیوں سے بچ کر نِکل آیا۔ تیسری جگہ پر سکھ گارڈ نے خُوب اچھی طرح سے ہاتھ پھیر کر اُسے ٹٹولا تو انڈہ پکڑا گیا۔ پھر فضل اَور گارڈ کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ فضل کی زبانی کچھ یُوں تھا۔

"واہگرو، سردار جی، تسی کیہڑے ضلعے دے ہوں؟"

"امبر سَر دے ضلعے دا ہاں۔ پر توں ایہہ گل چھڈ، ایہہ دس کہ آنڈا تے ککڑی داہا، توں کویں دِتا ہا؟"

"آنڈا تے سردار جی ککڑی دا ای اے۔"

"پر چڈیاں تے تیریاں وچوں نکلیا ہا۔"

"سردار جی گل اَیہہ وے کہ حلات دی وجہ نال تسی ساڈے اُتے پہرے دار مکرر ہو گئے او، پر تسی امبر سَر دے تے میں لہور دا، ہے تے اَسی بھرا بھرا ای آں ناں۔ سال توں اُتے ہو گیا اے آنڈے دی شکل نہیں ویکھی، ایہہ آنڈا چھڈ دیو تے ساری عمر تہاڈے بچیاں نوں دُعاواں دیاں گا۔"

قصہ مُختصر سکھ کا دِل پسیج گیا اَور اُس نے انڈہ فضل کو دے دیا۔ دِن بھر ہم نے انڈے کو اَیسے سنبھال کے رکھا جیسے کوہ نور ہیرا ہو۔ انڈے کی سکیم ہم چاروں کے درمیان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ وَیسے بھی ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ چار سے زیادہ آدمیوں میں بٹ کر انڈے کی صورت شکل بگڑ جائے گی۔ چنانچہ ہم اَپنی روٹی اَور دال کھا کر فارغ ہُوئے اَور اُس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ ونگ کمانڈر اِمتیاز عشاء کی نماز پڑھنے نہ چلا گیا۔ اب ہمارے پاس تقریباً بیس مِنٹ تھے۔ اُس کے جاتے ہی ہم نے سب سے پہلے ڈھیلی تار پر لٹکتا ہُوا بلب کھینچ کر نیچا کیا اَور اُسے تولئے سے ڈھانپ دیا تاکہ روشنی کمرے سے باہر نہ نِکلنے پائے۔ اُس کے بعد ہم نے میز پر ایک سفید کاغذ پھیلایا، اُس پر ایک طرف نمک کی چھوٹی سی ڈھیری لگائی۔ ایک ایک گلاس پانی کا سب نے سامنے رکھا۔ پھر انڈہ چھیل کر چھری سے، جو ہم نے باورچی سے اُدھار لی تھی، نہایت احتیاط اَور صفائی کے سَاتھ انڈے کے چار برابر ٹکڑے کئے۔ اب ہم کھانا کھانے کے لئے تیار تھے۔ مگر پہلے ہم نے اُن لوگوں کی خاطر جنہیں یہ کھانا میسر نہیں تھا، اَور وہ لوگ جو زخمی اَور بیمار تھے، اَور وہ جو ہمارے ساتھی تھے اَور میدان کارزار میں کام آئے تھے، اَور آخر میں میجر شاہ زمان کی خاطر، سَر جھکا کر احتراماً ایک مِنٹ کی خاموشی اختیار کی۔ اِس کے بعد ہم نے اَپنا اَپنا پانی کا گلاس اُٹھایا اَور ایک سَاتھ کہا، "پاکستان، زندہ باد،" اَور ایک ایک گھونٹ پی کر گلاس نیچے رکھ دیئے۔ اب پہلا کورس شُروع ہُوا۔ ایک ایک چٹکی نمک اُٹھا کر مُنہ میں ڈالا اَور اُسے گلے سے اُتارنے تک چوستے رہے۔ پھر دُوسری چٹکی۔ اِس کے بعد مین کورس کی باری آئی۔ چھری سے اَپنے اَپنے حصے کے انڈے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹا اور ایک ایک ٹکڑا اُٹھا کر مُنہ میں رکھا۔ مُنہ پہلے ہی نمکین تھا، اُبلے ہُوئے انڈے کی خُوشبو دہن سے حلق کی نسوں تک میں سرائیت کر گئی اَور ایک انوکھا لطف آیا۔ اِس ایک چوتھائی انڈے کو ختم کرنے میں ہم نے دس مِنٹ صرف کئے۔ اس کے بعد آخری کورس کے طور پر اَپنا اَپنا پانی کا گلاس اُٹھا کر گرم گرم کافی سمجھتے ہوئے گھونٹ گھونٹ پیا۔ وِنگ کمانڈ اِمتیاز کے آنے سے پہلے ہم نے میز صاف کی، بلب سے تولیہ اُتارا اَور اُسے کھینچ کر چھت تک اُونچا کر دیا۔ پھر ہم اپنی اَپنی چارپائیوں پہ لیٹ گئے۔ اُس وقت ہم اَیسا سیر محسُوس کر رہے تھے جیسا کبھی کسی بینکوئٹ کے بعد بھی نہیں کیا۔

آج کل مجُھے کیپٹن سلطان کے بارے میں فکر لگی ہے۔ مگر اگلے خط میں لکھوں گا۔ اگر سب کچُھ آج ہی لکھ دیا تو پھر اگلے خط میں لکھنے کے لئے کیا رہ جائے گا؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرفراز نے قلم سیدھا کر کے اصل خط لکھنا شروع کیا۔ "ڈیر نسیمہ۔ میں بالکل تندرست ہوں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اُمید ہے کہ وہاں سب لوگ ٹھیک ہوں گے۔ ہم جلد ملیں گے۔ سرفراز۔"

ڈیرسٹ۔ تُمہیں یاد ہو گا کہ پچھلے خط میں، میں نے کیپٹن سلطان کے بارے میں لکھا تھا۔ میری اپنی رجمنٹ سکستھ پنجاب کا ہے۔ اُس کا ذہن کچھ گڑبڑ ہو رہا ہے۔ یہ بات نہیں کہ اُس کا دماغ چل گیا ہے، بس ذرا غیر متوازن ہوتا جا رہا ہے۔ ٹھیک ہے، جن واقعات کی بنا پر ہم اِس حالت کو پہنچے ہیں اُن سے ہم سب غیر مطمئن ہیں، بلکہ ہمارے دِل میں گہرا رنج ہے، اَور کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی صورت میں شاید اِس کا بیان بھی ہو جائے گا۔ مگر بیلنس اَور ڈسپلن ضروری چیزیں ہیں، خاص طور پر ہمارے موجُودہ حالات میں تو اِن کے بغیر آدمی کے اَندر انارکی پھیل سکتی ہے۔ ہمیں اِن سب باتوں کا احساس ہے۔ مگر سلطان کو ایک جنون ہو گیا ہے۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ جب کسی شے کے خلاف رنج اِتنا بڑھ جائے کہ دماغ پر ہی چھا جائے تو پھر یہ ایک اَیسے چکر کی صورت اِختیار کر لیتا ہے جو نہ گھٹتا ہے اَور نہ ایک مقام پر رُک کر کھڑا رہتا ہے، بلکہ اپنی ہی پیدا کردہ قوت کے سہارے بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک طرح سے یہ آدمی کا جذباتی سہارا بن جاتا ہے۔ یہ واقعہ میں نے اِس عرصے میں سلطان کے ساتھ ہوتے دیکھا ہے۔ پہلے چند ماہ تک وہ بالکل نارمل تھا۔ جب ہماری فرار کی سکیم ناکام ہُوئی تو جمیل اسے سہار نہ سکا۔ (اِس ناکامی کی تفصیل اگلے خط میں لکھوں گا۔) وہ اَپنے علاوہ سب کو الزام دینے لگا۔ پہلے وہ ہم میں سے ایک کو، دُوسرے کو، تیسرے کو ناکامی کا قصوروار ٹھہراتا تھا۔ کبھی کہتا کہ سٹریٹجی غلط تھی، کبھی یہ کہ ضرورت سے زیادہ آدمیوں کو شریک کر لیا گیا۔ آخر ایک بار کیپٹن عامر نے معنی خیز اَنداز میں اُس سے کہا، "بالکل ٹھیک کہتے ہو، ہمیں یہ بات آپس میں رکھنی چاہئے تھی، ایک دو باہر کے آدمیوں کو شامل کر کے ہم نے غلطی کی،" تو وہ سمجھ گیا۔ پھر وہ اُس بات کو چھوڑ کر ساری جنگ کی سٹریجی تک پہنچ گیا۔ ہر وقت اُس کی زبان پہ تنقید کا حرف ہوتا تھا۔ پہلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہل تو وہ ٹیکنیکل قسم کی تنقید کرتا تھا، کہ آرمر سپورٹ نہیں تھی، اِیئر کوَر نہیں تھا، وغیرہ وغیرہ، جو ہم سب آپس میں جنگ کا تجزیہ کرتے ہُوئے کیا کرتے تھے۔ یہاں کی زندگی بسر کرتے ہُوئے اب ہمارے اَندر سے فتح و شکست کا احساس ختم ہو گیا ہے۔ اب جنگ ہمارے لئے فتح اَور شکست کا میڈیم نہیں رہی، بلکہ ایک تھیوریٹیکل ایکسرسائیز بن کر رہ گئی ہے۔ اول تو اب ہم اِس کا ذِکر ہی کم کرتے ہیَں، کرتے بھی ہیَں تو کبھی کبھی، وقت گزُاری کی راہیں تلاش کرتے ہُوئے، یا ریڈ کراس کے لئے چھوٹی چھوٹی شکایتیں درج کرتے ہُوئے جو ہمیں علم ہوتا ہے کہ کیمپ کے ڈاکخانے سے آگے نہیں جائیں گی، یا اگلے وقت کے کھانے کا انتظار کرتے ہُوئے، لاتعلق سے اَنداز میں، جیسے ہمارا اِس کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہ ہو بلکہ محض ایک کتابی مشق کی صورت ہو، اِس پہ اَپنا اَپنا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ صرف ایک کیپٹن سلطان اَیسا شخص ہے جو اِس موضوع کو ذہن سے محو نہیں ہونے دیتا۔ آہستہ آہستہ تنقید کی منزل سے گزُر کر وہ نکتہ چینی پر آ گیا ہے۔ پچھلے ہفتے اِس کی اَور عامر کی گرماگرمی ہو گئی تھی۔

"ہم نے کوئی جنگ جیتی بھی ہے؟" سلطان نے کہا۔

"سکسٹی فائیو میں،" عامر بولا۔

"ربش،" سلطان نے کہا۔ "اگر چائنا اَپنی بکریاں واپس لینے کی دھمکی نہ دیتا تو اٹھتالیس گھنٹے کے اَندر اَندر ہمار ڈیفنس کولیپس ہو جاتا۔ ہمارے پاس ٹروپ ریپلیسمنٹ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ یہ نمبرز گیم تھی جناب۔"

"تو تمُہارے خیال میں نشانِ حیدر وَیسے ہی دے دیئے گئے تھے؟"

"درست دیئے گئے تھے۔ اُس جنگ میں ہمارے افسروں اَور جوانوں نے شجاعت کی داستانیں رقم کی تھیں۔ میں اُن کو سلوٹ کرتا ہوں۔ اِس دفعہ تو وہ بھی نہیں ہُوا۔ نہ کوئی دِلاوری کے قصے نہ لیڈرشپ کے افسانے۔ لیٹ ڈاؤن آفٹر لیٹ ڈاؤن۔ اِس کی تاریخ کو کبھی نہ لکھا جائے گا، اگر لکھی گئی تو بدل دی جائے گی، حذف کر دی جائے گی، اَپنے مطلب کی لکھی جائے گی اَور پوری قوم کو خُود فریبی کے جال میں پھنسا دیا جائے گا۔ بلڈی لیٹ ڈاؤن۔"

"کیا مطلب ہے تمُہارا؟" عامر غصّے سے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"لُک عامر، تُمہیں اچھی طرح پتا ہے ہمیں کیا دیا گیا۔ آرٹلری کی کم از کم بیس رجمنٹیں ہونی چاہئے تھیں۔ اَور تھیں کتنی؟ صرف چھ۔ بڑی سے بڑی فیلڈ ہاوٹزر گنیں تھیں۔ کوئی میڈیم اَور ہیوی آرٹلری نہیں تھی۔ آرٹلری اَور آرمر کا کوئی ڈویژنل کامپلیمنٹ نہیں تھا۔ ایک آرمرڈ رجمنٹ تھی، وہ بھی اُنیس سو بیالیس کے زمانے کے چالیس عدد چیفی ٹینک تھے۔ اِس کا کیا مطلب ہے؟"

"کیا مطلب ہے؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے لیڈروں نے پہلے ہی مشرقی پاکستان سے ہاتھ دھو لینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔"

"کبھی لوجسٹکس کے بارے میں بھی سوچا ہے؟" عامر نے صبر سے کہا۔

"نو مہینے لوجسٹکس کے لئے کم تھے؟ پھر اِس کے بعد ملٹری لیڈر شپ کی کیا حالت تھی؟ ہم نے فکسڈ پوزیشن ڈیفنس کرکے اَینیمی کو اِدہر اُدہر سے گزُر کر ڈھاکہ پہنچنے کا موقع دے دیا۔"

"سلطان، تم اُس لیول کی بات کر رہے ہو جس کے بارے میں تُمہیں کچُھ علم نہیں۔ تُمہاری ساری تھیوریاں مفروضوں پر مبنی ہیَں۔"

"ہو سکتا ہے مفروضے ہوں، مگر اِن کا جواب مانگنا کیا میرا حق نہیں؟ مصیبت تو یہی ہے کہ ہمیں کچُھ علم نہیں، اَور نہ ہی کبھی ہو گا، یہ مجھ سے لکھوا لو۔"

"یُو آر ٹاکنگ نان سینس۔"

"نان سینس کا کیا مطلب۔ یہ فیکٹس اینڈ فگرز ہیَں۔"

"تُم وقت سے پہلے بول رہے ہو۔ وقت آنے پر بولنا، سب پتا چل جائے گا۔ بہادری صرف فیلڈ آف بیٹل میں ہی نہیں ہوتی، بہادری یہ بھی ہوتی ہے کہ یو کیپ یور ماؤتھ شٹ۔"

لیفٹیننٹ فضل نے بحث کا یہ رنگ دیکھا تو بیچ میں کود پڑا۔ "آج بکرے آئے ہیں،" اُس نے اعلان کیا۔ "کسی نے دیکھے ہیَں؟"

سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ "نہیں۔"

"میں نے دیکھے ہیَں،" فضل نے فخریہ کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیسے ہیں؟"

"اُدھر راجستھان کے صحراؤں میں ایک علاقہ ہے جہاں صرف بکرے پائے جاتے ہیں، آدمی نہیں پائے جاتے۔"

"فضل، بی سیریس۔"

"یہ بالکل سچ ہے۔ وہاں خشک سالی کی وجہ سے قحط پڑ گیا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا ہے؟"

"میں نے اخبار میں پڑھا ہے۔" فضل نے کہا۔

"بکرے مر گئے؟"

"نہیں، بھاگ بھاگ کر ادھر آ رہے ہیں۔"

"پھر؟" کئی آوازوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

"انہیں پکڑ پکڑ کر یہ لوگ ہمارے کیمپوں میں سپلائی کر رہے ہیں۔"

"وہ بکرے تو بڑے کمیور ہونگے،" لیفٹیننٹ عالم نے، جو رہتک سے تعلق رکھتا تھا، کہا۔

"پہلے ہمیں کونسے پلے ہوئے بکرے ملتے تھے،" کوئی سوگوار انداز میں بولا۔

"مگر یہ بکرے،" فضل لفٹننٹ عالم کو دیکھ کر بولا، "تو زیادہ ہی کمیور ہیں۔ جب گارڈز نے باڑ کے اُوپر سے اندر پھینکے تو جہاں گرے تھے وہیں کے وہیں پڑے رہے۔ دارے باورچی نے کہا کہ یہ ایسی رف ہینڈلنگ برداشت نہیں کر سکتے، دو منٹ میں مر جائیں گے۔"

"پھر کیا ہوا؟" کسی نے ایسے دریافت کیا جیسے کوئی کہانی بیان کی جا رہی ہو۔

"اُس نے اُسی وقت ذبح کر دیئے۔"

"خون نکلا؟"

"کچھ نکلا۔"

"خون بہنا چاہئے،" میجر صدیق، جواب ہر بات میں نیگیٹو ہو گیا ہے، بولا۔ "خون کی دھار بہتی ہوئی دکھائی دینی چاہئے۔ یہ دینی مسئلہ ہے۔"

"نکلا ہی ہو گا" ایک آواز جواب میں اُٹھی۔ "کیا فرق پڑتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہم یہاں بکروں کے سہارے زندہ نہیں ہیں،" میجر صدیق جوش سے بولا۔ "یہاں پر دین ہمارا سہارا ہے۔"

"ہاں ہاں، نِکلا تھا، نِکلا کیوں نہیں تھا،" فضل نے جلدی سے جواب دیا۔ "خُون کی دھار بہتی ہوئی میں نے خُود دیکھی تھی۔ بالکل مناسب طور پر جانور حلال کئے گئے ہیں۔"

"کوئی گوشت ووشت بھی تھا؟" شاہ زمان نے جھجکتے ہُوئے پُوچھا۔

"اوں ہوں،" فضل نے نفی میں سر ہلایا۔

"چھیچھڑے تو ہوں گے،" کسی نے کہا۔

"ہوں گے۔ دکھائی نہیں دیئے تھے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہڈیوں اور چھیچھڑوں کی مِکھ سے فلیور تو نِکل ہی آتا ہے۔"

"مِکھ کا پتا نہیں۔ ہڈیاں تو تھیں۔"

"ہڈیوں میں مِکھ ضرور ہوتی ہے۔"

"اوئے فضل،" کیپٹن عامر گویا جاگ اُٹھا، "تو نے کہا تھا کہ وہاں بکرے ہی بکرے ہیں، آدمی کوئی نہیں۔ اِس سے تیرا کیا مطلب تھا؟"

"لکھا تو یہی تھا،" فضل نے جواب دیا۔

"کہاں لکھا تھا؟"

"اخبار میں۔"

"کونسی اخبار میں؟"

"کوئی اخبار تھا۔"

اب ہر ایک اِس گفتگو میں حِصّہ لینے لگا۔ "میں نے تو نہیں پڑھا۔"

"نظر سے مِس ہو گیا ہو گا۔ کوئی ایک ایک خبر تھوڑی پڑھی جاتی ہے۔"

"اخبار میں ہر قسم کی خبریں ہوتی ہیں۔ ایسی ایسی خبر ہوتی ہے کہ اِنسان دنگ رہ جاتا ہے۔"

"ہاں ہاں، بعض اخباروں میں ایسی خبروں کا کالم ہوتا ہے۔ اُس کا عنوان ہوتا ہے "عجوبہ روزگار،" یا "عجیب و غریب،" یا صرف "حیرت انگیز۔" میں وہ کالم ضرور پڑھتا ہوں۔ نئی نئی باتوں کا پتا چلتا ہے۔"